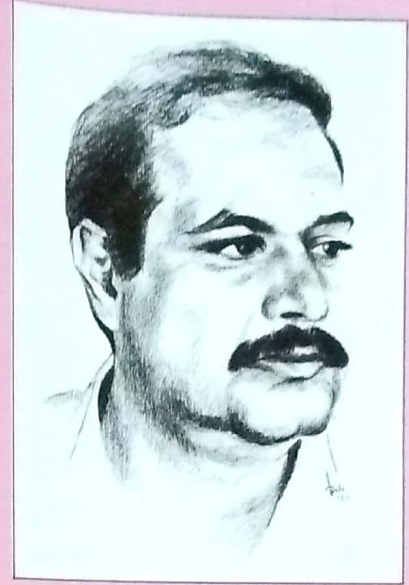


بارش کی ساتویں شام

امجد بہزاد

بارش کی ساتویں شام

امجد بہزاد



--- امجد بہزاد سرکوں کو پارادکس ہے۔۔۔ اور شہر کو بے امان مانتا ہے۔ راستوں کو
کھٹکتانی اور شہر کو قاتل گردانتا ہے۔۔۔ بادیاں کھلے رکھتا ہے۔ کہ منتشر لوگوں میں رہنا
نہیں چاہتا۔ جتنی جنگھاتی سرکوں پر تادیر گھومنا چاہتا ہے اور جنگلوں کی طرف ہجرت کا
تمنا ہے۔ مگر۔۔۔ وہ چاتا کہیں بھی نہیں کہ نامعلوم رویہ اس کے پاؤں کی زنجیر بن جاتا
ہے۔

امجد کی شاعری میں اسے رویے کا اظہار اور ہر کلمہ کی سطح پر نیند اور سنہنہ ہانگ کر دیا گیا
نامعلوم بھی نہیں ہے۔ یہ رویہ ایسے اشعار میں سراٹھا کر دیکھتا ہوا آپ کو مل سکتا ہے۔
اور اسی سے امجد کا لہجہ منفرہ ہو جاتا ہے۔

زمین زادوں سے امجد کٹ کے جینا غیر ممکن ہے
سندر سے جزیروں کو ہا ہوتے نہیں دیکھا

ناصر علی سید

Ketabton.com

۷۰

خدا - کائنات کا سربراہ ہے
 اس کا قلوب سے تعلق ہے
 اعلیٰ

-- حالت اپنے دور میں گردن ڈوٹی رہا۔۔۔ رائے اور
 میراگی اپنے دور میں۔
 آج بھی بعض شراہ اپنی تجرباتی شاعری اور
 فضا کے نئے مفہوم کے باعث قدماء کی نظر میں
 تاشوں ہیں۔ لیکن نیا ہی پر دور کا پر لول دست ہوتا
 ہے۔ وہ فن لب و لہجے اور ذہن کی نئی راہیں تلاش
 ہے۔

امجد مراد نے دور کی نئی سوچ کے مستور اظہار کا شاعر
 ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ "پارسی کی ساتویں شام"
 نئے پارسیوں نئی فضا اور پارسی کے تازہ تر موزوں
 نظموں کی مالا ہے۔ وہی نئی جگہ دمک نئی تازگی
 کا پیام ہے۔ ایسی کتاب کہ نئے دور کے شعر پسند
 حضرات کو غائب، اقبالی، فیض، مدیم اور فرزا کے
 ساتھ مل کر پڑھنے سے شاعری کا ارتقاء اور بدستے لب
 و لہجے کا مرقا حاصل ہوگا۔

پروفیسر طاہر غزنوی

-- امجد کی شاعری میں کسرا کی برف پوش پتلی
 سے سرمنی ہادی کی سرگوشی سننی جا سکتی ہے۔
 یہاں آپ کنگشاں نے پا ہونے کے منظر ناپیدہ
 دیکھیں گے اور وہ بھی ایسی ایسا کی فضا میں جو
 لہجہ و لہر آگ سے مختار ہے۔

پروفیسر غلام محمد قاسم

-- امجد خراب تاشوں میں اپنی دریافت کے سطر
 پر نکلا ہوا انوجوان شاعر ہے۔ خراب تاشوں کے منظر
 بھی طرح طرح کے امرا لڑھے رہتے ہیں۔ سو وہ
 سحر زدہ ہے۔ انتظار ہے کہ مسرور امجد کو اس سطر میں
 منظروں کے لمس کی سرخوشی نصیر آجائے۔

سہ ماہ

PDF by Tahir Abid Taair

۔۔۔ اہد کے کلام میں جو اور بھینٹیلیں ہے۔ وہ اس کی اپنی لاپالی شخصیت کی عطا ہے۔۔۔ اشعار میں ایسی کیفیت ہے۔ جس میں آج تک کوئی نام نہ دے سکا۔ اس کے لہجے میں موسیقی کے سارے سر گونج رہیں ہیں۔ "بارش کی ساتوں شام" کی دھتک آسمان ادب پر متنوع رنگوں کیساتھ طلوع ہو رہی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اپنی ہی سرود میں گم، اپنے الفاظ کے تال پر رقص کناں ہمارے ادب شاعر اس کا سوگت کس طرح کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔؟
پروفیسر حامد سروش

اہد بہزاد کی شاعری میں دھتک کے سارے رنگ موجود ہیں مگر ان رنگوں کو پینٹ کرتے ہوئے اہد جس نئے انداز اور نئے لہجے کو اپنایا ہے۔ اس نے اہد کی شاعری کو ایک خونگوار حیرت سے ہمکنار کیا ہے۔ اس کے لہجے کی انقراوت میں اجنبیت کا کوئی احساس نہیں ملتا بلکہ برعکس والا نئے تجربات اور نئے آہنگ کو اپنی ہی بات سمجھ کر قبول کرتا ہے۔ اہد کی غزل اور نظم دونوں میں "قلبی واردات" اپنی پوری شدت کیساتھ موجود ہے۔۔۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔ اس واردات کو اس نے روایت کیساتھ ساتھ جدت کا پیریں بھی دیا ہے اور یہی خصوصیت اسے سمیر میں نمایاں کرتی ہے۔

یوسف عزیز آمد

بارش کی ساتویں شام

امجد بہزاد

Printed by: Peshawar Process, Peshawar City.
Ph. (P.P): 250662-212743

جملہ حقوق بحق ” فریدہ نور “ محفوظ

انتساب

یقیناً خدا نے سب سے پہلے دوستی کا رشتہ تخلیق کیا ہو گا

شعیب الدین اور فردوس خان

کے نام

| | |
|---|-------------|
| بارش کی ساتویں شام | نام کتاب |
| امجد بہزاد | مصنف |
| اکتوبر ۱۹۹۷ء | تاریخ اشاعت |
| جہانزیب ملک | سرورق |
| ادرلیس شاہ کمپوزنگ سنٹر قصہ خوانی پشاور | کمپوزر |

اہتمام : سردار نعیم

رابطہ

انجمن بہزاد عابد سٹریٹ گل بہار
کالونی نمبر ۱۰ پشاور شہر

| | |
|-----|-----------------------|
| ۱۰۱ | ماہ تمام چمکا |
| ۱۰۳ | وہ بھی خیال و خواب |
| ۱۰۵ | خداوں کی حفاظت |
| ۱۰۷ | دیکھ تجھے ہوگا |
| ۱۰۸ | رات مجھے رستے میں |
| ۱۱۰ | کسی کو دیکھ کر |
| ۱۱۲ | کسی جمال میں |
| ۱۱۳ | گلا میں کیسے کروں |
| ۱۱۳ | سارا شہری |
| ۱۱۶ | کھڑا ہوں کب سے |
| ۱۱۷ | دو شعر |
| ۱۱۸ | وہ خام |
| ۱۱۹ | سب سزاؤں کی |
| ۱۲۱ | یہ دکھی دکھی سے |
| ۱۲۳ | شیشہ دل |
| ۱۲۳ | آخری حیرت باقی ہے |
| ۱۲۵ | ہزار لوگوں میں |
| ۱۲۷ | دو شعر |
| ۱۲۸ | یہ کیا کہ صبح خام |
| ۱۳۰ | آواز |
| ۱۳۲ | موسم کڑا تھا |
| ۱۳۳ | شب سیاہ میں |
| ۱۳۳ | کون سفاک کے ختاب |
| ۱۳۵ | خواب میں کسی ہوئی نظم |
| ۱۳۷ | شہر کے سب باسیوں کا |
| ۱۳۸ | یہ کیا کہ لطف خام |
| ۱۳۹ | کوشش کی بات کی |
| ۱۴۰ | حسرت |

| | | | |
|-----|------------------------------|----|------------------------------|
| ۵۷ | صبح کا نمناک سورج | ۱۱ | اپنی آنکھیں اپنے خواب |
| ۵۹ | کتر کو ایمان کر سکتا ہوں میں | ۱۷ | خدا سے |
| ۶۱ | ہوا یہ کیا کہ فخرانہ | ۱۸ | میں اور وہ |
| ۶۲ | زندگی | ۱۹ | نگار حسن کو بے آئند |
| ۶۳ | اے کاش کہ کوئی | ۲۱ | رات کا تاسا سفر ہے |
| ۶۵ | ڈیپرشن | ۲۳ | تیری مرضی جو تو چاہے |
| ۶۶ | پرہیز خاگر | ۲۳ | خائب |
| ۶۷ | آب زر کی بے کرانی | ۲۵ | اک جمال منظر کا |
| ۶۹ | کیا شب تھی | ۲۶ | یہ میں نے تم سے |
| ۷۰ | جادو سا کوئی جاگا | ۲۸ | اک مستقل نباہ |
| ۷۲ | پاکستان | ۳۰ | وہ اگلے موڑ پہ |
| ۷۳ | شہرے تو قیام میں | ۳۱ | کس قدر اواسی ہے |
| ۷۶ | مہم خواب | ۳۳ | بدل جانے کا دکھ |
| ۷۷ | محمودی | ۳۳ | آخری خواب |
| ۷۸ | شہر کے اور کچھ نہ کیا | ۳۷ | یہ واقعہ آج کا نہیں |
| ۷۹ | میں تم سے دور | ۳۸ | دور تک تاسا سڑک |
| ۸۱ | تیز ہوا تھی | ۴۰ | نیل نلک کو |
| ۸۳ | غنی خان | ۴۲ | یہ جو تیری آنکھوں |
| ۸۵ | اعتراف | ۴۳ | ایک شعر |
| ۸۶ | ایک منظر | ۴۳ | جبر |
| ۸۷ | منی کا آدمی | ۴۵ | ندی کنار میں اور تو |
| ۸۹ | میں ہسول جاؤں | ۴۶ | ہر منظر اک لوحہ |
| ۹۰ | یہ چپ ہے کیسی | ۴۸ | اک دشت بے کنار |
| ۹۱ | نقش ہونا | ۵۰ | سارے ہنرستانی کے |
| ۹۳ | فارغ بخاری | ۵۲ | پہاڑی |
| ۹۵ | خود سے اب | ۵۳ | خام غم یہ تو بتا |
| ۹۶ | یہ چپ کی ممد | ۵۳ | دور شہر سے جنگل میں |
| ۹۷ | تنتا تھا میں بھی | ۵۵ | بارش کی ساتویں خام |
| ۹۹ | ابر بہار خام | ۵۶ | اے تسانی تیرا کوئی ہراز نہیں |
| ۱۰۰ | قطعہ | | |

اپنی آنکھیں اپنے خواب

رئیس فروغ کا ایک شعر ہے

آنکھیں جو بے حال ہوئی ہیں دیکھ لیا تھا خواب پرایا
اس حوالے سے جب ہم اردو شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شعراء کی
اکثریت پر اے خواب دیکھنے پر مامور ہے۔ جب سے خوابوں کا قحط پڑا ہے مستعار خوابوں کے ہجوم
نے شاعری کی پوری فضا کو گرد کے منظر نامے میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس کمرے میں بہت کم شاعر
ایسے ملیں گے جنہیں اپنے خوابوں کا اجالا راستہ دکھاتا ہے انہی کم شاعروں میں امجد بھزاد کا نام
شامل کیا جا سکتا ہے ہمارے اس نوجوان شاعر کی آنکھیں اس لئے بے حال نہیں ہوئیں کہ یہ
اپنے خواب دیکھنے کی صلاحیت سے مالا مال ہیں اور پھر تعبیر کی خواہش اس خواب گوں ماحول کو
مزید پر اسرار اور طلسماتی بنا دیتی ہے

جادو سا کوئی جاگا بادل کے برسنے پر
اک منظر نو چکا موسم کے بدلنے پر

نقڑی آواز کوئی بن گئی زنجیر پا
دشت کے تنہا سفر میں ہم کو رکنا پڑ گیا

خاک جاں میں بھی تو اک حیرت کدہ آباد ہے
کیوں یہ میری چشم ویراں دیکھتی ہے دور دور

شاعری میں اپنی بات کہنے کے مضمرات بتاتے ہوئے رئیس فروغ نے کہا تھا

پھول خوبانیوں کے جھومتے ہیں
کر رہی ہیں ہوائیں بوس و کنار
اور میں اپنے ہونٹ کاٹتا ہوں

ہر موسم کا اپنا اپنا مول ہوا کرتا ہے
سرا کی برقی ہوا میں آؤ منائیں سوگ

میں وہ ہوں

جو سمندر کی تہوں میں
نیل گول چپ چاپ پانی میں
کسی من موہنی سی جل پری سے گفتگو میں محو رہتا تھا

چند اچھی نظمیں یا غزلیں تخلیق کرنا اتنا مشکل کام نہیں جتنا کہ شاعری کے لئے نیا زمین
نیا آسمان پیدا کرنا ہے۔ امجد بھڑا نے جو کچھ کہا ہے وہ اس کا اپنا تجربہ اور اس تجربے کا اظہار
ہے۔ شاعری کے نگارخانے میں اس نے اپنے دکھ سکھ حوط کر کے بھجائیں ہیں۔

ہر چند تیرا قرب مری دسترس میں تھا
میں نے ترے وجود کو آدھا نہیں کیا

نکس پانی میں جو دیکھا تو بہت رنج ہوا
یہ کھلا آج کہ دریا کی روانی کیا ہے

امجد بھڑا نے حکیمانہ خواب دیکھنے کی قبل از وقت خواہش سے دامن بچا کر اپنے فن کی
بلاغت برقرار رکھی ہے اس کا ہر خواب اس کی چھوٹی موٹی آرزوؤں کی ٹکست و ریخت کا بیان ہے

جس دن سے اپنی بات رکھی شاعری کے سچ
میں کٹ کے رہ گیا شعرائے کرام سے

لیکن انفرادیت کی راہ پر چلنے والے اس آگ میں بے خطر کودتے ہیں۔ رئیس امر وہوی
کے الفاظ میں

یا رب غم عشق کیا بلا ہے
ہر شخص کا تجربہ جدا ہے

لہذا جو شاعری انفرادی تجربہ بیان کرنے کی طاقت نہیں رکھتی وہ کلیشے سے آگے نہیں
بڑھتی اور امجد بھڑا کو زندگی اور شاعری دونوں میں روایتی رستوں پر چلنا ناپسند ہے
امجد بھڑا کے کام پر نظر ڈالنے سے پہلا تاثر یہی ابھرتا ہے کہ یہ نوجوان انتہائی صداقت
سے اپنا لہجہ دریافت کرنے کے کرب ناک عمل میں مبتلا ہے۔ اس کی شاعری میں کسار کی برف
پوش چوٹی سے سرمئی بادل کی سرگوشیاں سنی جا سکتی ہیں۔ یہاں آپ کمکشاں کو زیر پا ہونے کے
منظر نا دیدہ دیکھیں گے اور وہ بھی ایک ایسی ابھام کی فضا میں جو فہم و ادراک سے معتبر ہے۔
امجد بھڑا کا شمار ان شعراء میں کیا جا سکتا ہے جو نظم و غزل پر یکساں عبور رکھتے ہیں۔ اس
کی شاعری میں جہاں عناصر کا ذکر ہوا ہے وہ مقامات اس کی مجموعی شاعرانہ فضا میں بہت بلندی پر
واقع ہیں۔

کیا شب تھی کہ مئے تھے اطراف کناروں کے
اور قافلے ٹھہرے تھے دریا میں ستاروں کے

دکھ تجھے ہو مگر شہر کو جل جانا ہے
تیرے شاعر نے بہت دور نکل جانا ہے

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دل پذیرِ متاعِ ہنر کو میں

غالب

ہے۔ یہاں آپ کو ایسے بچے کی سسکیاں سنائی دیں گی جو جبلتِ تبتس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنا
کھلونا خود توڑ دیتا ہے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ امجد بھزاد نے کہیں کہیں توانی کی حد تک آزادی برقی
ہے ورنہ فکر رواں کے بتے دھارے میں وہ مروجہ سانچوں سے مکمل بغاوت کا اظہار بھی کر سکتا
تھا۔

کفر کو ایمان کر سکتا ہوں میں
جنگ کا اعلان کر سکتا ہوں میں
اور اب یوں ہے کسی لمحے میں بھی
شر کو دیران کر سکتا ہوں میں

کہتے ہیں سوال کبھی غلط نہیں ہوتا اس کا جواب نامعلوم یا غلط ہو سکتا ہے۔ امجد بھزاد کی
شاعری اپنے عہد سے کچھ سوال کرتی ہے۔
شب سیاہ میں یہ روشنی سی کیسی ہے

سوچتا ہے اک فریادی
کون ہمارا حاکم ہے

یہ ہوا ہے کیا کہ تمہے نہیں تزی انگلیاری کا سلسلہ
لمحہ وصل کا کیا ربط ہے سرشاری سے ہا
بجر کا کرب ہے کیا یہ آنکھ کا پانی کیا ہے ہا
آئے امجد بھزاد کے کلام میں ان سوالوں کے جواب تلاش کریں

پروفیسر غلام محمد قاصر

خدا سے

میں نے تجھ کو سوچا نہیں ہے دیکھا ہے

میں نے تجھ کو کھیلتے دیکھا باغوں میں بچوں کے ساتھ
میں نے تجھ کو ہنستے دیکھا سرخ ریلے ہونٹوں میں
میں نے تجھ کو روتے دیکھا مظلوموں کی آنکھوں میں
میں نے تجھ کو قہر میں دیکھا آندھی اور طوفانوں میں
میں نے تجھ کو بے خود دیکھا شام ڈھلے پیانوں میں
میں نے تجھ کو سوچتے دیکھا پھیلے ہوئے صحراؤں میں
میں نے تجھ کو سوتے دیکھا ہرے بنوں کے سایوں میں
میں نے تجھ کو گاتے دیکھا بارش اور ہواؤں میں
میں نے تجھ کو رقصاں دیکھا معشوقوں کی بانہوں میں

میں نے تجھ کو سوچا نہیں ہے دیکھا ہے

نگارِ حسن کو بے آئینہ ہوتے نہیں دیکھا
تو کیا تم نے بھی کوئی سانحہ ہوتے نہیں دیکھا
مگر کل شام یہ منظر مری آنکھوں میں کھلنا تھا
پرندوں کو درختوں سے خفا ہوتے نہیں دیکھا
رعایا نے بھی بینائی کسی جنگل میں دفنا دی
کہ شاہوں نے کسی کا بھی بُرا ہوتے نہیں دیکھا

میں اور وہ

میں یہ کہتا ہوں سفر آسان ہونا چاہیے
وہ یہ کہتا ہے نہیں ہلکان ہونا چاہیے
میں یہ کہتا ہوں نموشی عشق کی معراج ہے
وہ یہ کہتا ہے نہیں اعلان ہونا چاہیے
میں یہ کہتا ہوں بڑے بے کیف ہیں لیل و نهار
وہ یہ کہتا ہے کوئی ارمان ہونا چاہیے
میں یہ کہتا ہوں "خدا" کا عکس ہے میرا وجود
وہ یہ کہتا ہے نیا امکان ہونا چاہیے
میں یہ کہتا ہوں سچلے مجھ پر جمالِ کائنات
وہ یہ کہتا ہے نہیں حیران ہونا چاہیے
میں یہ کہتا ہوں سخن کچھ بھی نہیں جڑ دردِ سر
وہ یہ کہتا ہے نہیں دیوان ہونا چاہیے



رات کا تنہا سفر ہے، روشنی ہے دور دور
ایک بابِ غم کھلا ہے اور خوشی ہے دور دور

میں کھلے میدان میں ہوں غنچے بے سائبان!
وہ گھنے جنگل میں مجھ کو ڈھونڈتی ہے دور دور

شر کے دیوار و در پر خوف کی اک تیل ہے
وہ محبت کی کہانی لکھ رہی ہے دور دور

باروں نے بھی تیرے وصل کی جھوٹی تسلی دی
کسی موسم کو میں نے بے ریا ہوتے نہیں دیکھا

چلو ہم ہی تمہیں یہ منظر ناہیدہ دکھلا دیں
کہ تم نے کھکشاں کو زیرِ پا ہوتے نہیں دیکھا

زمیں زاووں سے امجد کٹ کے جینا غیر ممکن ہے
سمندر سے جزیروں کو رہا ہوتے نہیں دیکھا

.....

تیری مرضی جو تو چاہے

اے ری دنیا!
تیری مرضی جو تو چاہے
میرا کیا ہے تیرے جیسا ہو جاؤں گا
جو تو کہے گی وہی کروں گا
کوئی کویتا نہیں لکھوں گا
تیری لے میں کھو جاؤں گا
تیری لے وہ لے ہے کہ جس میں
ایسی چیختی رائلیاں ہیں
جن کو سن کر پنکھ پکھیرو اڑاؤ جائیں
بادل جنگل اور سمندر
چپ ہو جائیں روٹھتے جائیں
اپنے مدھر گیتوں کی تانیں توڑتے جائیں
اے ری دنیا تیری مرضی جو تو چاہے

شدتیں ہیں ماند لیکن درو دل جو تھا سو ہے
غیر موسم میں بھی کونسل گوکتی ہے دور دور
خاکِ جاں میں بھی تو اک حیرت کدہ آباد ہے
کیوں یہ میری چشمِ ویراں دیکھتی ہے دور دور
یہ فباہِ کارواں ہے یا سرائے غم کی سست
اک ہوائے تیز ہے جو چل رہی ہے دور دور
منتشر لوگوں میں امجد تاکے ہو صبح و شام!
ایک آوازِ درا میں نے سنی ہے دور دور



اک جمالِ منتظر کا مان رکھنا پڑ گیا
تیز بارش میں ہمیں گھر سے نکلنا پڑ گیا

نقڑی آواز کوئی بن گئی زنجیرِ پا
دشت کے تنہا سفر میں ہم کو رکنا پڑ گیا

بے ستارہ رات پر اس نے کیا افسوس کیا
تیرگیِ شب میں مہجنگو کو چمکنا پڑ گیا

اس کا کنا ہے محبت راز رکھنی چاہیے
کتنی مشکل میں ہمارا شعر کنا پڑ گیا

بد دعا یہ رات کی ہے یا تلون ہے مرا
صبح کے آغاز کا انجام کرنا پڑ گیا

شائبہ

وہ جو برہنہ پرست پر دو پیڑ کھڑے ہیں

اک دوجے سے کچھ دوری پر

جیسے کہ میں ہوں

جیسے کہ تو ہے

وہ بھی ہیں کچھ ڈرے ڈرے سے

ہم بھی ہیں کچھ سسے سسے سے

شام سے کی دکھی ہوا میں

دونوں ملنا چاہتے ہیں پر مل نہیں سکتے

کسی نے مجھ کو صدا تو دی تھی
میں اپنی ضد میں ہرکا نہیں تھا

وہی تھا عمد زوال میرا
جب آئینہ، آئینہ نہیں تھا

نہیں ہے یوں بھی کہ موت آئی
بس اتنا ہے میں جیا نہیں تھا

○
یہ میں نے تم سے کہا نہیں تھا
کہ میرے گھر میں دیا نہیں تھا

چار جانب تھا ہو کا عالم
مری زمیں پر خدا نہیں تھا

ہوا میں سیٹی سے بچ رہی تھی
کوئی کسی کا رہا نہیں تھا

تہائیوں نے ہم کو خود آرا سا کر دیا
زخمِ ہنر کی دل نے نمائش ہی کی نہیں

ہم طول دے تو سکتے تھے شب ہائے وصل کو
اُس چشمِ سرگیں نے گزارش ہی کی نہیں

آخر سنوڑوں کو بھی چپ سا دھنا پڑی
تو نے کسی سخن کی ستائش ہی کی نہیں



اک مستقل نباہ کی خواہش ہی کی نہیں
ہم نے ترے خلاف یہ سازش ہی کی نہیں

کرنا تھا جس کے بحر میں ہم نے کسی کو یاد
سرمایہ کے بادلوں نے وہ بارش ہی کی نہیں

بے عشق روز و شب کا ہمیں بھی ہے دکھ مگر
حسنِ بتاں نے دل میں رہائش ہی کی نہیں



کس قدر اُداسی ہے
بات گو ذرا سی ہے

یہ زمین صدیوں سے
کس کے خون کی پیاسی ہے

باہر اد سڑکوں پر
کیسی بد حواسی ہے

خواہشوں کے جنگل میں
سرپھری ہوا سی ہے



وہ اگلے موڑ پہ میرے لئے رکا ہو گا
کسی سے کیا کہ وہ خود سے بھی ڈر گیا ہو گا

خوشا وہ لمحہ کہ جب اس کے ہونٹ چومے تھے
اور اب یہ سوچتا ہوں کیا وہ سوچتا ہو گا

وہ میرے جسم کے اُسرار لے کے پھڑپھڑا تھا
اکیلی راتوں کو وہ کیسے کانٹا ہو گا

یہ دکھ بھی ہے کہ وہ میرا شریک کرب رہا
میں جاگتا ہوں تو وہ کیسے سُوسکا ہو گا

یہ شہر گنگ سہی میرے حق میں اے امجد
وہ ایک شخص مگر مجھ سے بولتا ہو گا

.....

بدل جانے کا دکھ

مجھے کیا جانتے ہو تم

مجھے پہچانتے ہو تم۔۔۔

میں وہ ہوں۔۔۔ جو سمندر کی تموں میں۔۔۔ نیلگوں چپ چاپ پانی میں

کسی من موہنی سی جل پری سے گفتگو میں محو رہتا تھا

میں وہ ہوں۔۔۔ جو درختوں کے خشک سایوں میں سو کر

جاگتا رہتا تھا ان گزرے زمانوں میں

میں وہ ہوں۔۔۔ جو نگار شہر کی ہر جاں ستاں مصروفیت سے

امن کی خاطر

ہمیشہ لڑتا رہتا تھا

رہیلے گیت لکھتا تھا

میں وہ ہوں۔۔۔ جو سسکتی شام کو

اک ہمسکراتی شام کرنے میں

شرابی دوستوں کو ڈھونڈ کر ہنگامہ کرتا تھا

مجھے کیا جانتے ہو تم۔۔۔

مجھے پہچانتے ہو تم۔۔۔

چاندنی کی ہجرت پر
رات بے نوا سی ہے

کون مجھ کو پہچانے
کس سے روشناسی ہے

خامشی کے صحرا میں
نقرئی ندا سی ہے

معتبر گھرانوں کا
عشق بھی سیاسی ہے

راز یہ کھلے امجد
تو ولی کہ عاصی ہے

—

کہ سبزپتوں پہ ساری خوشیوں کو نقش کر دیں
اب اس سے پہلے کہ موت آئے
نموش سرما کی بارشوں میں
ایلی سرکوں کو اپنے قدموں کی چاپ دے دیں
کہ بعد اپنے..... کے خبر ہے..... نموش سرما کی بارشوں میں
کسی کا سایہ دکھائی دے گا؟
کسی کی آہٹ سنائی دے گی؟
اب اس سے پہلے کہ موت آئے
بیاض شب میں وہ خواب لکھ دیں
کہ دیدہ و دل کے واسطے جو
گلاب بھی ہیں عذاب بھی ہیں
یہ خواب، جب ہم نہیں رہیں گے
کسی کی آنکھوں..... ستارہ آنکھوں کے کام آکر
کہانیوں میں رہا کریں گے
اب اس سے پہلے کہ موت آئے

آخری خواب

اب اس سے پہلے کہ موت آئے
ہمارے جسموں..... کثیف جسموں کی کمکٹائیں
خراب شاموں..... جوان راتوں کے آسمان کی حدوں سے گر کر
زمیں کی تمہ میں ہوں ریزہ ریزہ
قریب آؤ..... گنہ نہیں ہے..... قریب آؤ
کثیف جسموں سے حظ اٹھائیں
اب اس سے پہلے کہ موت آئے
چلو کہ رو لیں..... اور اتنا رو لیں
کہ شامِ غم کا بخار نکلے
چلو کہ خوشیوں کو ورغلا کر
سیاہ جنگل..... ہرے درختوں میں لے کے جائیں
اور اتنی شدت سے تمقوں کو وقار بخشیں



یہ واقعہ آج کا نہیں ہے کئی زمانوں کی بات ہے یہ
کہ سینہٴ عشق کے مقابل کڑی کمانوں کی بات ہے یہ

یہ شہرِ اوبام ہے یہاں پر محبتوں کا نصیب ہجرت
یہ میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ آسمانوں کی بات ہے یہ

برہنہ سڑکوں پہ تم کو کیسے میں خوشبوؤں کا پتہ بتاؤں
گھنے درختوں میں مجھ سے ملنا چھپے خزانوں کی بات ہے یہ

یہ میں بھی کیا ہوں کہ عاشقی سے ہوس کی تہذیب کر رہا ہوں
میں آدمی ہوں بہت پُرانا نئے جمانوں کی بات ہے یہ

.....

عجیب سے اک سفر پہ نکلیں
کہ جس میں منزل نہ راستوں کا خیال رکھیں
کبھی سمندر کی سبز لہروں پہ پاؤں رکھ کر
کسی جزیدے کی خامشی سے کلام کر لیں..... سلام کر لیں
کبھی ہواؤں میں اُڑتے اُڑتے
اک اجنبی سے کسی نگر کے برستے بادل کا ہاتھ تھامیں..... زمیں پہ اُتریں
کسی کو ڈھونڈیں..... اور اتنا ڈھونڈیں
یہ بھول جائیں کہ کون ہیں ہم
نا تمام

دکھ ہوا ہے دیکھ کر وہ کیا تھا اور کیا ہو گیا
ابتداء میں مان لیتا کاش وہ کہنا مرا

اشک باری بھی نہیں ”بے نام چپ“ کی چارہ جو
بارشوں کے بعد بھی موسم نہیں بدلا مرا

تیرگی شب میں امجد پی ہے میں نے اس قدر
صبح نارنجی سے بھی اترا نہیں نشہ مرا



دور تک تنہا سڑک ہے میں ہوں اور سایا مرا
کتنا اچھا لگ رہا ہے بے نوا ہونا مرا

ایک دشتِ رائیگاں ہے دھوپ کی حد پر کھلا!
کیا بُرا ہوتا جو کوئی مسخر ہوتا مرا

چاہتا اظہار ہوں اظہار کی توقیر بھی
کیا فصیلِ شہر پر رہ جائے گا لکھا مرا

دنیا سے اختلاف کا اچھا نہیں ماں
سب لوگ کہہ رہے ہیں جو تم بھی کہا کرو

صحرا کی وسعتیں تری جاگیر ہیں مگر
گاہے کسی غزال کے دل میں بھی جا کرو

بے وقت موت سے تری ڈرتے ہیں ہم بہت
آج یہ غم کڑا ہے مگر خوش رہا کرو



نیلِ فلک کو آہ سے اپنی سیہ کرو
ہو بتلا تو میر کی سنت ادا کرو

شاید کسی کی آنکھ سے آنسو نکل پڑیں
دنیا بے طریق کا نوحہ لکھا کرو

خودِ حمن بے مثال فریبِ خیال ہے
ہر حسن بے مثال کو دھوکہ دیا کرو

ایک شعر

ہر چند تیرا قرب مری دسترس میں تھا
میں نے ترے وجود کو آدھا نہیں کیا



یہ جو تیری آنکھوں کی نیلاہٹ ہے
گرے دُکھ کی چُپ میں سکھ کی آہٹ ہے

کوئی موہن منظر آنکھ میں کھل جائے
جانے کتنی صدیوں کی اُکتاہٹ ہے

پت جھڑ موسم، میں اور میرا سناٹا
تھا سڑک اور دور تک پیلاہٹ ہے

روشنیوں کو نظم کروں گا کیسے میں
وسعتِ دل میں سہمی ہوئی دُھندلاہٹ ہے



ندی کنار میں اور تو۔
لہ لہ کوئی جادو

میں ترا سایہ ہو جاؤں
تو میرے سائے کو چھو

دکھی دکھی ہے حسن ترا
جیسے کیٹس کی نظم ہو تو

ہرے بنوں کو مت جھلسا
شہر میں رہ اے شہر کی لو

امجد ساعتِ قرب میں بھی
دل میں ہے اک عالم ہو

.....

جبر

دور کسی جنگل میں بادل مجھ کو ڈھونڈتے ہوں گے
دور کسی صحرا کی وسعت مجھ کو سوچتی ہو گی
دور کہیں باغوں میں کوئل مجھ کو گونجتی ہو گی
دور کسی ساگر کی موجیں مجھ کو کھوجتی ہوں گی
دور کسی کی اچھی آنکھیں مجھ کو روتی ہوں گی
— اور میں دفتر میں بیٹھا ہوں نانِ جوئی کی خاطر

ہرے بنوں میں دور کہیں
کوئی نجات کا رستہ ہے

اچھا ہے کوئی اور نہیں
میں ہوں مرا سناٹا ہے

تاریکی کے شاعر نے
روشنیوں کو سوچا ہے

شہر کبیر کے لوگوں میں
کوئی فقیر بھی ہوتا ہے

جا امجد اب لوٹ بھی جا
گھر ترا رستہ نکلتا ہے

○

ہر منظر اک نوحہ ہے
ہاٹ حسن میں روتا ہے

دیوانہ کوئی ایک ہوا
چاند تو سب نے دیکھا ہے

شام ڈھلے اک تنہا شخص
سڑک سے باتیں کرتا ہے

ناموسِ عشق کے لئے شہرِ ریا کے بیچ
اک مُبتلا سے شخص کو گلیوں میں خوار دیکھ

تجھ کو سفر سے باز نہ رکھوں تو کیا کروں
دشتِ طلب کی حد پہ یہ گرد و غبار دیکھ

آخر تجھے بھی لگ گئی لاحاصلی کی چُپ
کس نے کہا تھا تجھ کو سمندر کے پار دیکھ



اک دشتِ بے کنار میں اس کو پکار دیکھ
اس شامِ انتظار کو دل میں اتار دیکھ

اے موت تیری خیر کہ تو لازوال ہے
با اختیار لوگوں کو بے اختیار دیکھ

مُتلا چکی ہے شر کی یک منظری سے آنکھ
اے دل کوئی پسند کا اپنے دیار دیکھ

کہ وہ باتیں مری باتیں نہیں ہوتیں
کہ وہ باتیں مری تھمائی کی قاتل نہیں ہوتیں
مگر بے رات ہماری رات میں
شاخِ ہنر پر پھول کھل جائیں
تویں لگتا ہے کوئی ہم درینہ مہری
ساری باتیں ڈھونڈ لایا ہے کہیں سے
مگر اے کاش ان وحشت زدہ لہجوں میں
خود کو میں یہ سمجھاؤں
کہ یہ تھمائی ہی تو ہم درینہ ہے میری
مری شاخِ ہنر پر پھول جتنے بھی ہیں
اس کے ہیں

سارے ہنر تھمائی کے ہیں

میں اس سے بھوت کتا ہوں
مجھے تجھ سے محبت ہے
میں تھمائی سے گھبرایا ہوا
اک توئی ہوں

اور

باتیں ڈھونڈتا پھرتا ہوں گلیوں ہو گلیوں میں شاہراؤں پر
مگر بائیس ہوتا ہوں



شامِ غم ! تو جانتی کہانی کیا ہے
رو رہی ہے تو جنہیں اُن کی نشانی کیا ہے

ہاہاں کھولیں کہ برام کریں ساحل پر
کچھ نہیں کھٹا ہواؤں کی زبانی کیا ہے

تو کہ یک طرفہ محبت کا حوالہ ہے مرا
داستانِ شبِ غم تم کو سُنانی کیا ہے

لٹا وصل کا کیا ربط ہے سرشاری سے،
ہجر کا کرب ہے کیا؟ آنکھ کا پانی کیا ہے؟

کس پانی میں جو دیکھا تو بہت رنج ہوا
یہ کھٹا آج کہ دریا کی روانی کیا ہے

پسپائی

اب ایسے شر میں وہ کیا رہے گا
وہ اک سالیہ ہے بن میں جا رہے گا

بڑے ظالم ہیں اس بستی کے باسی
یہاں اب عمر بھر نود رہے گا

بارش کی ساتویں شام

ساتویں شام ہے بارش کی
گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی
شاید کل سورج نکلے گا



دور شہر سے جنگل میں ہیں خوش قسمت سے لوگ
چھوٹی چھوٹی خوشیاں جن کی چھوٹے چھوٹے روگ

ہرے درختوں کی سُندرتا بھید یہ کھولے جائے
سُندر تھے وہ لوگ جنہوں نے بن میں لیا تھا جوگ

ہر موسم کا اپنا اپنا مول ہوا کرتا ہے
سرا کی برفلی ہوا میں آؤ منائیں سوگ

بجھے بجھے چہرے ہیں لیکن روشن روشن باتیں
کتنی رونق والے ہیں یہ دکھی دکھی سے لوگ

جتنا تجھ کو سلجھاؤں میں اور الجھتے جاؤ
تم نے امجد پال رکھے ہیں کیسے کیسے روگ



صبح کا نمناک سورج جبر کا غماز ہے
رات کی تاریکیوں میں کوئی گہرا راز ہے

ہو نہ ہو اے دل کسی کو ہجر لاحق ہے کہیں
شامِ سرا کی ہوا سے درد کا درواز ہے

گو بظاہر مہراں نا مہراں کوئی نہیں
آنکھ سے اوجھل مگر اک شخص تیر انداز ہے



اے تنہا! تیرا کوئی ہمراز نہیں ہے
عرضِ ہنر بھی وحشت ہے اعجاز نہیں ہے

شہر سے ہجرت کی تو دکھ کچھ اور بڑھے ہیں
جنگل میں بھی کونسل کی آواز نہیں ہے

وہ میرا دکھ کیسے سمجھے کیسے بانٹے۔
میرا باہر اندر کا غماز نہیں ہے

ورنہ ترے انجام کو بھی ہم سوچتے رہتے
اچھا ہوا دنیا تیرا آغاز نہیں ہے

کسی بھیاںک خواب کے ڈر سے آنکھ میں امجد
اک مدت سے نیندوں کا درواز نہیں ہے



کفر کو ایمان کر سکتا ہوں میں —
جنگ کا اعلان کر سکتا ہوں میں

صبح کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
رات پر احسان کر سکتا ہوں میں

اور اب یوں ہے کسی لمحے میں بھی
شر کو دیران کر سکتا ہوں میں

غصہ دل ہے مگر اک ٹھوک کا
ذات کو نشان کر سکتا ہوں میں

شاعری کے باب میں اپنا ہے اتنا تجربہ
شعر کتنا عجز میرا شاعری اعجاز ہے

سوچتی کیا ہو گی وہ مصروفیت کا ہو بُرا
دور جنگل میں مری ایک گشدرہ آواز ہے

ہجر ہے بترآد یہ آسیب کا سایہ نہیں
بے سبب کی بے قراری عشق کی غماز ہے



ہوا یہ کیا کہ فقیرانہ چال چلنے لگے
ذرا سی پی لی تو سب لوگ اچھے لگنے لگے

برا نہیں جو بُری عادتیں بنا ڈالیں
کہ اچھے دوست تو سب رفتہ رفتہ مرنے لگے

کل اس کی آنکھیں بھی خوابوں سے خالی خالی تھیں
سوہم بھی خوابوں کی دنیا سے اب نکلنے لگے

.....

شہر لیلیٰ کا اشارہ چاہیے
دشت میں گزران کر سکتا ہوں میں

اک لبِ لطیف کی جنبش کے عوض
نقدِ جاں قربان کر سکتا ہوں میں

عشق کو خود داریوں سے کیا غرض
منتِ دربان کر سکتا ہوں میں

عشق بھی امجد کرشمہ ساز ہے
حسن کو حیران کر سکتا ہوں میں

اے کاش کہ کوئی اور بھی جانے

ٹپ ٹپ 'ٹپ ٹپ

بارش برسی

بارش موسم سرما کی

شام ہے

لیکن

پچھلے پہر کی تاریکی ہے

تاریکی میں "سنٹیٹ لائٹس" سے

جھل جھل

زندگی

کیا عجب ہو

کہ کسی رات کے سناٹے میں

لوگ چنیں کہ قیامت آئی

دلفنتا "نوٹ پڑیں

عرش سے ماہ و انجم

اور

ریزہ ریزہ ہوں پھاڑوں کے بدن

کرنے ارض کے ہر گوشے میں

زندگی توڑوے دم

اور ہوا ہو جائے

جس نے صدیوں سے مرے ذہن کو الجھائے رکھا

ایک پل میں

وہ متعہ... حل ہو جائے

ڈیپریشن

اک پر خوف سے ویرانے میں
پاگل گئے اور جگاڑے
مجھ کو نوپتے رہتے ہیں
کون بچائے..... کون بچائے
کوئی نہیں..... کوئی بھی نہیں
.....

وہ تنہا چپ چاپ سڑک
جو میت ہے میری برسوں سے
کیوں
شعر کے.... کیوں نظمیں لکھیں
کیا دکھ ہے یہ سب جانتی ہے
یہ جانتی ہے اس چپ کا مطلب
جو آنکھوں کی ویرانی میں بولتی ہے
یہ جانتی ہے اس ہنسی کا مطلب
جو ہونٹوں کی نیلاہٹ میں روتی ہے
لیکن اس کے جاننے سے کیا ہوتا ہے



آبِ نَدْرِ كِي بے كِرَانِي چاہیے
مَر رہے ہيں لوگ پَانِي چاہیے

میں بھی اس سے تگ آیا ہوں بہت
تم کو میری زندگانی چاہیے؛

یہ ہوس تو نیند میری لے اڑی
عشق کی کوئی کہانی چاہیے

پروین شاکر کی المناک موت پر

بڑی ضدی ہے ضد کب چھوڑتی ہے
وہ ”خوشبو“ کی زباں میں بولتی ہے

یہ کیسا سانحہ ”صدرگاہ“ دل پر
بڑی منحوس پت جھڑکی جھڑکی ہے

مگر یہ موت کیوں برحق ہے امجد
یہ کیا پروین شاکر مر گئی ہے

.....



کیا شب تھی کہ مہکے تھے اطراف کناروں کے
اور قافلے ٹھہرے تھے دریا میں ستاروں کے

بادل کے برسنے پر اک لڑکی کو خوش دیکھا!
پت جھڑ میں بھی در آئے آثارِ بہاروں کے

یہ میں جو نہیں سگا تپتے ہوئے صحرا میں
اک شخص کی یادوں میں سائے تھے چناروں کے

اے شہر بڑے شہر! رہنے بھی سکوں سے دو
منظر ہیں بہت پیارے چھوٹے سے دیاروں کے

آج میں مہک جاؤں پر کیسے مہک جاؤں
اے کاش کہ کھل جائیں چہرے مرے یاروں کے



سہل اور دشوار راہوں سے پرے
ایک رستہ کھکشانی چاہیے

بن میں کوئی ڈر نہ تھا آسیب کا
شہر میں نقل مکانی چاہیے

سب بلاؤں سے رہائی کے لئے
اک بلائے آسمانی چاہیے

دشمنوں کی کیا ضرورت ہے ہمیں
دوستوں کی مہربانی چاہیے



بدست ہواؤں کو زیبا ہے یہ سگستانی
ہر چند وہ ناخوش ہے آنجل کے سرکے پر

سوچا تھا محبت میں اک طرفہ قیامت کا
حیراں ہیں بہت دونوں چپ چاپ سلگنے پر

فٹ پاتھ کے شاعر تو یہ جرم نہیں کرتے
کیوں لظم کسی تم نے چڑیوں کے چمکنے پر

.....



جادو سا کوئی جاگا بادل کے برسنے پر
اک منظرِ نو چکا موسم کے بدلنے پر

انجامِ بُرا ہو گا، اک شخص نے روکا تھا
الجھا تھا کوئی مجھ سے دُنیا سے اُجھنے پر

تاکامِ محبت کو ہے ننگ سحر کرنا
تادم ہوں بہت میں بھی اک رات کے کٹنے پر

رہنماؤں سے کہو راہ نہ دکھلائیں ہمیں
منزلِ صبح کی ہم راہ گزر جانتے ہیں

اے وطن ایک سے بیٹے تو نہیں ہوتے سب
وہ سرائے میں سہی ہم تجھے گھر جانتے ہیں

وہ تھی دست ہی ہیں افسرِ شاہانہ کہ جو
سنگ ریزوں کو ترے لعل دگر جانتے ہیں

کون طناز ہے یہ بے ہنری پر اپنی
سر کو ساز کہ ہم رقصِ شرر جانتے ہیں

پیارے پاکستان کے حوالے سے

مسکِ عشق کہاں صاحبِ زر جانتے ہیں
عظمتِ خاکِ وطن خاکِ بر جانتے ہیں

اب تو لازم ہوا ہم پر کہ مقابل آئیں
تجھ کو اربابِ ہوس لقمہ تر جانتے ہیں

کیوں ذرات ہو ہمیں صاحبو! تنہا سے
زندگی کرنے کے ہم سارے ہنر جانتے ہیں

وقت یہ بہاد ہو بے کار کی باتوں میں کیوں
خود کا ہی جا بجا کرتا رہوں تیرا رہوں

منتشر ہونے کا ڈر ہے جان تیرے شہر میں
دور جنگل میں کہیں کیجا رہوں تیرا رہوں

تو کہ خوشبو ہے تیری تشبیر ہونی چاہیے
میں ہوائے شام کا جھونکا رہوں تیرا رہوں

تو کہے تو گنگناؤں کوئی اچھی سی غزل
شاعروں کے واسطے عنقا رہوں تیرا رہوں

—

شہر بے توقیر میں تما رہوں تیرا رہوں
تو نہ پہچانے مجھے سایہ رہوں تیرا رہوں

کذب کے دربار میں مجھ کو شرف حاصل نہ ہو
تیرہ گلیوں میں کہیں سچا رہوں تیرا رہوں

سے پرستی کو حریفِ درد دل کیونکر کہوں
بارشوں میں ہجر کو سہتا رہوں تیرا رہوں

محرومی

پھول خوابوں کے جھومتے ہیں
کر رہی ہیں ہوائیں بوس و کنار
اور میں اپنے ہونٹ کاٹتا ہوں

مہم خواب

مہم و اوراک سے بھی
ایک مہم رہتا ہے مجھ میں



میں تم سے دُور ہونا چاہتا ہوں
میں اپنے ساتھ رہنا چاہتا ہوں

رہوں میں تاکے شب کا مجاور !
میں گہری نیند سونا چاہتا ہوں

ہوس بھی اک بُری سی ضد ہے میری
میں بچہ ہوں، کھلونا چاہتا ہوں



شعر کہے اور کچھ نہ کیا
شکر ہے اک شاعر تو جیا

کس کو اتنی فرصت تھی
میں نے تجھ کو حفظ کیا

لوگ تھے اللہ والے سب
میں نے تیرا نام لیا

ایک ہوا کے جھونکے نے
خوشبو کا در کھول دیا

غزلیں کہہ کر سوچتا ہوں
تو نے مجھ کو کیا نہ دیا

—



تیز ہوا تھی نشتر سے بھی زوروں پر تھا
بحر وہ کیسا سرمئی شام کی سڑکوں پر تھا

قربت میں بھی اس نے مجھ کو تنہا رکھا
مجھ پر جو احسان تھا وہ کب اوروں پر تھا

میں اس کے ہونٹوں کی لالی سوچ رہا تھا
اور وہ حیراں قوسِ قزح کے رنگوں پر تھا

بڑی بے کیف شامیں کٹ رہی ہیں
شرابی شام کرنا چاہتا ہوں

مجھے ڈر ہے کہ ظالم ہو نہ جاؤں
کسی سے میں بھی ڈرنا چاہتا ہوں

اب اگلا موڑ شاید ہجر کا ہو
وہ رکنا اور میں چلنا چاہتا ہوں

یونہی کاغذ کئے جاتا ہوں کالے
نہیں لکھا جو لکھنا چاہتا ہوں

کوئی مجھ کو بھی امجد رو رہا ہے
کسی کو میں بھی رونا چاہتا ہوں

”فریاد کی کوئی لے نہیں ہے“

پشتو کے عظیم فلسفی شاعر غنی خان لیونے
کی وفات پر

آشنگانِ شہر کا دلدار مر گیا
بلہ محبتوں کا طلب گار مر گیا

کب ہنر جو کرتا تھا تیرے وجود سے
اے حسنِ بے مثال! وہ فنکار مر گیا

اے بہارِ ثنوت کے برسا ہے رات بھر
یوں ہے کہ کوئی صاحبِ اسرار مر گیا

قاتلِ شہر میں نھرا لیکن فکھ تو یہ ہے
ہرے بنوں کا خون بھی میرے ہاتھوں پر تھا

—
اجد میں بے سالیہ رہا ہوں دھوپ کی حد پر
شکر ہے میرا سالیہ میرے بچوں پر تھا

—

اعتراف

اے زندگی! اے خوبصورت زندگی
کتنا بھیاںک کر دیا ہم نے تجھے

اب کون نہ دلوں کی کرے گا مصوری
خوبیاں کی صحبتوں کا گرفتار مر گیا

ہاں سے پیو ضرور مگر خامشی کے ساتھ
رندانِ شہر دیکھنا وہ یار مر گیا

حیرت ہے آج ناصح بے درد موم ہے
ہر اک سے کہہ رہا ہے کہ اوتار مر گیا

”ویراں ہے میکدہ غم و ساغر اداس ہیں“
وجدان و آگہی کا وہ نے خوار مر گیا



مٹی کا آدمی تھا کہ وہ نور مخلص تھا
صورت تو عام سی تھی مگر نور مخلص تھا

گلتا تھا ہم کو ثابت و سیار دور سے
نزدیک جا کے دیکھا تو وہ چہرہ مخلص تھا

ایک منظر

ہرے درختوں کے سائے ہیں
اک لڑکی چپ چاپ کھڑی تھی
اور پھر نوٹ کے بادل برسا

—



میں بھول جاؤں اسے یہ گال اور ہے کچھ
دل تباہ کا لگان خیال اور ہے کچھ

تو وصل رات کو کھتی ہے اُد بُد ہوا
پہ میں وہ سوچتا ہوں وہ وصل اور ہے کچھ

اس نے ہم کو بھی دکھ لئے اپنے ہیں مگر
طلب ہے جس کی ہمیں وہ لگال اور ہے کچھ

بست مہین سنی آہوان شہ مگر
وہ دل کے دشت میں ہے وہ نوزال اور ہے کچھ

.....

خوش ہوں کہ اس دیار میں کوئی مری طرح
دیئے بے طریق سے مشورہ مخلص تھا

موسم تو بھر کا تھا مگر بھر کا نہ تھا
نزدیک تر بھی تھا وہی وہ اور مخلص تھا

کیا استعارے عرض سخن کو وہ دے گیا
دشت برہنگی میں وہ مشورہ مخلص تھا

پتھری زمانہ کا آہدہ گد نہیں
کشم میں رہا ہوں کہ مشورہ مخلص تھا

.....



نقش ہونا چاہتے ہیں بے نشان ہو جائیں گے
شعر جتنے بھی کہے ہیں رائیگاں ہو جائیں گے

شاعروں کو صاحبو! حکیم زباں بندی نہ دو
مل گئی سب کو زباں تو بے زباں ہو جائیں گے

دیک دشت رائیگاں میں دوڑتے جاتے ہیں ہم،
ہے یقین خود پر مگر وہم و گماں ہو جائیں گے



یہ چُپ ہے کیسی دکھوں کا تو در کھلا بھی نہیں
محبّتوں کا وہ یک طرفہ سلسلہ بھی نہیں

فکستِ عہد وفا جان اور کیا ہو گا
کہ میں بھی سوچتا ہوں تیرا فیصلہ بھی نہیں

یہ اور بات کہ مجھ تک پہنچ نہ پائے تو
میں منتظر ہوں ترا اور فاصلہ بھی نہیں

ہمارے حق میں کہیں خود کُشیِ ثواب نہ ہو
سک رہے ہیں کہ مرنے کا حوصلہ بھی نہیں

اکیلا ہوں تو کسی سے گلہ نہیں بہزاد
بجز میں اپنے کسی سے کبھی ملا بھی نہیں

.....

فارغ بخاری مرحوم کے لئے

جسم ہے خاک مگر زخمِ ہنر زندہ ہے
کیا ہوا تھک گیا تو تیرا سفر زندہ ہے

جیو آج بھی ہے ایک نئی دنیا کی
سب کی آنکھوں میں ترا خواب نگر زندہ ہے

آج بھی قافلہٴ اہلِ محبت ہے رواں
فاصلے گھٹتے نہیں راہِ گزرِ زندہ ہے

جز ترے کون کرے نعرہٴ مستانہ بلند!
شہرِ زندہ ہے مگر خاکِ برِ زندہ ہے

ساری دنیا سے کئے اک آدمی کو دکھ ہے یہ
خرم و شاداب چہرے سب دھواں ہو جائیں گے

جیت میں ہزار ہے خود میں سمٹ جانے کا ڈر
ہار جائیں گے اُسے تو بیکراں ہو جائیں گے



خود سے اب اختلافِ سفر کرنا چاہیے
جس رہ چلے جلوس جہاں چلنا چاہیے

کچھ تو طلسمِ شام و سحر سے سوا نبھی ہو
جینا ہر انہیں ہے مگر مرنا چاہیے

شاید کتابِ حسن ہی بابِ نجات ہو
اس کو بٹھا کے پاس ات پڑھنا چاہیے

آؤ سکوتِ عشق کی دیوار توڑ دیں!
ہر امن رہ چکے ہیں بت لڑنا چاہیے

بہزاد یوں نہ رات کو تا دیر گھومیں
ہے بزدلوں کا شر یہاں ڈرنا چاہیے

دھوپِ سفاک سہی، درپٹے آزار سہی!
سایہ دینے کو مگر ایک شجرِ زندہ ہے

کاش لہرائے پھر اک جامِ ہوا میں فارغ
لوگ کتے ہیں وہ باریدہ تر زندہ ہے



تینا تھا میں بھی تیری ضرورت مجھے بھی تھی
یہ اب کھلا کہ تجھ سے محبت مجھے بھی تھی

اب کیا گلہ کہ کوئی مجھے جانتا نہیں
لوگوں سے دور رہنے کی عادت مجھے بھی تھی

اچھا ہوا کہ وقت نے دیران کر دیا
کچھ زندگی بتانے کی بجلت مجھے بھی تھی

شادی کہیں بھی ہو سو ہو وہ خوش مگر رہے
مجبور عاشقوں کی یہ حسرت مجھے بھی تھی

یہ چپ کا عمد مرے شر میں مدام رہا
مگر وہ شخص کہ جو مجھ سے ہمکلام رہا

وہ مہراں تھا تو کیوں میکدوں کا رخ کرتے
سکتی شاموں میں میرے لئے وہ جام رہا

کے ہیں شعر جو فرقت میں کیسے اچھے ہوں
کہ مجھ میں ہجر کا موسم برائے نام رہا

مرے لئے تو وہ جیسے کھلا سمندر تھا
یہ میں ہی سوچ کے کچھ خود ہی تشنہ کام رہا

ابر بہارِ شام میں

ابھی کچھ دیر پہلے۔۔۔
صبح و شامِ زندگی سے
کس قدر بیزار تھا میں
کتنی نفرت تھی مجھے
عین ممکن تھا۔۔۔ کسی بھی لمحہ منوس میں
پہمت کے چٹھے سے لگ کر
خودکشی کر بیٹھتا میں
دلفتا "یہ کیا ہوا۔۔۔ ابر بہارِ شام میں
اک ہوائے تیز نے۔۔۔ بوندیں وہ برسائیں کہ بس۔۔۔!
صبح و شامِ زندگی پر
اعتبار آ ہی گیا

میں بھی پلٹ کے آگیا تشنہ لیبوں کے ساتھ
دریا کو دیکھنے کی رعایت مجھے بھی تھی

"مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاء کو"
عالم سے کوئی دور کی نسبت مجھے بھی تھی

—



ماہِ تمام چمکا وہ بامِ یاد آیا
یادش بخیر ہم کو اک نامِ یاد آیا

دیکھا کسی کو ہم نے زلفِ دراز کھولے
برسوں کے بعد دل کو آرامِ یاد آیا

اک ہم ہی تیرے در کے ٹھہرے فقیر ورنہ
تیرے تو عاشقوں کو انجامِ یاد آیا

اک پھول کھل اٹھا کیا شاخِ ہنر پہ میری
گم گشتہ ساعتوں کا انعامِ یاد آیا

قطعہ

گاہے حدودِ دشت سے نکلا بھی کیجئے
کچھ تو خیالِ خاطرِ دنیا بھی کیجئے

ہر چند ذوقِ دشتِ نووردی بھی خوب ہے
لیکن کسی کو شہر میں لیلیٰ بھی کیجئے



وہ بھی خیال و خواب میں کچھ معتبر رہا نہیں
طے ہو چکے ہیں فاصلے کوئی سفر رہا نہیں

بے خود و مبتلا تو ہیں لیکن سپردگی نہیں
ہیں صد ہزار در مگر وہ سنگ در رہا نہیں

اک عشق بے پناہ سے ہم لازوال ہو گئے
ہونے کا اور نہ ہونے کا کوئی بھی ڈر رہا نہیں

کوئی کہے کہ عشق ہے یا محض دل لگی ہے یہ
دل میں کوئی رہا تو ہے کوئی مگر رہا نہیں

یہ بات ہے تو کیوں نا واں جا قیام کر لیں
ذکر بہشت سُن کر ” کلام ” یاد آیا

تم نے کہا تھا اسجد یہ محض دل لگی ہے
وہ صبح کا ملا تو ہر شام یاد آیا

.....



خداؤں کی حفاظت کر رہا ہوں
گنہ یہ حسبِ عادت کر رہا ہوں

مدینہ ہے نہ کوئی شہرِ کوفہ
بڑی بے سود ہجرت کر رہا ہوں

خدا مجھ کو یقیناً بخش دے گا
میں بچہ ہوں شرارت کر رہا ہوں

حکمت کہو تو ہے بجا لیکن ہنر نہ جانئے
فن جو کسی جمال کے زیرِ اثر رہا نہیں

بس ہو چکی ہے انتہا، آوارگی سے باز آ
بہزاد ایک عمر سے تو اپنے گھر رہا نہیں



دکھ تجھے ہو مگر شر کو جل جانا ہے
تیرے شاعر نے بہت دُور نکل جانا ہے

کون دیکھے گا یہاں کس کو ہے فرصت اتنی
چاند نکلا ہے مگر چاند نے ڈھل جانا ہے

میں وہ خود دار! خدا سے بھی نہ مانگوں تجھ کو
یہ الگ بات کہ اس دل نے چل جانا ہے

.....

ہے معنی خیز میری بے وفائی
حسینوں سے رعایت کر رہا ہوں

بہت مشکوک ہے کردار یزداں
سو خود تعمیر جنت کر رہا ہوں

زمانے سے پہچانا ہے کسی کو
محبت میں سیاست کر رہا ہوں

.....

آج بھی ہے دیوارِ دل کی ہر تصویر سے نفرت سی
کتنا ہمیں مایوس کیا ہے اس گھر کی آرائش نے

ورنہ کہاں ہم اور کہاں یہ عرضِ ہنر کی زیبائش
غزلوں کو دیوان کیا ہے ایک تری فرمائش نے

حال کی حد سے دور نکل کر ماضی ماضی ہو جاؤں!
کتنی پرانی باتیں چھیڑیں سرا کی اک بارش نے

.....



رات مجھے رستے میں روکا تیز ہوا اور بارش نے
کتنا شور مچایا دل میں ایک دبی سی خواہش نے

منہ سے کچھ نہیں کہتے لیکن نظم تو کرنا واجب ہے
کچھ تم نے برباد کیا ہے ، کچھ یاروں کی سازش نے

جی تو بہت لہلہایا لیکن دشت و جبل کی سیر نہ کی
جیسے قید کیا ہے ہم کو گھر کی ہر آرائش نے

کتنے دریاؤں، صحراؤں اور جنگلوں کا فسوں فخر تھا مرا
میں نہیں جانتا
میں نہیں جانتا
میں تو وہ ہوں کہ جو
اپنے ہی سائے میں سو گیا تھا
کل وہ تقریب میں جب تری یہ ستارہ سی آنکھیں انھیں مری جانب
تمیں علم ہے کیا ہوا؟
میں نے سائے کو دفنا دیا۔۔۔
میں نے سائے کو دفنا دیا۔۔۔

کسی کو دیکھ کر

تم اتنے برس کس نگر میں رہی
میں تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گیا تھا
اپنے ہی سائے میں سو گیا تھا
کتنے سرشار موسم یہاں آئے تھے
اور پلٹ بھی گئے
کتنے چہرے کھلے۔۔۔ کھل کے مرجھا گئے
کتنے ظالم یہاں۔۔۔ کتنے مظلوم تھے



گلہ میں کیسے کروں تجھ سے نارسائی کا
یہی جواز ہے میری غزل سرائی کا

انا پرست تو تھے لیکن اس قدر بھی نہیں
کہ قربتوں میں بھی موسم رہے جدائی کا

اسی لئے تو عدو سے نہ خون بہا مانگا
کہ میرے قتل میں تھا ہاتھ میرے بھائی کا



کسی جمل میں کھونا تھا، خود کو بھولنا تھا
کسی گھر میں ہمیں بھی کسی کو ڈھونڈنا تھا

بہت سی باتیں کھلاتی ہیں دشتِ جان میں پھول
مگر وہ بات کہ جس پر کسی سے روٹھنا تھا

مگر نکل نہ سکے اپنے دائرے سے ہم
خدا کو ماننا تھا اور بتوں کو پوجنا تھا

یہ اور بات کہ پتھر کا ہو گیا ہوں میں!
کسی پری کا پتہ خوشبوؤں سے پوچھنا تھا

میں تو خیر شکستہ تھا
تو بھی کہاں اب سالم ہے

وصل کا لحوہ خواب حسین
ہجر کا موسم دائم ہے



سارا شر ہی ظالم ہے!
اب تو ہجرت لازم ہے

سارے رشتے ٹوٹ گئے
درد کا رشتہ قائم ہے

سوچتا ہے اک فریادی
کون ہمارا حاکم ہے؟

ہو کہ نہ ہو یہ شر مگر
دوسینگوں پر قائم ہے

دو شعر

روٹھے ہیں ایک بار تو پھر گھر نہیں گئے
ہر چند جی نے چاہا بہت پر نہیں گئے

افعی کی طرح ڈستی ہے اب تو انائے عشق
ہم بھی کسی کو ہار کے کیوں مر نہیں گئے



کھڑا ہوں کب سے میں باہر پہ سوچتا ہی نہیں
عجیب شخص ہے دروازہ کھولتا ہی نہیں

میں سوچتا ہو کہ تجھ بن جیوں گا میں کیسے
تجھے یہ وہم کہ تجھ کو میں چاہتا ہی نہیں

شکست کھائی ہے ہر اک محاذ پر میں نے
یہ اور بات کہ میں ہار مانتا ہی نہیں

یوں کھینے کو تو میرا بھی دل مچلتا ہے
پر میرے ساتھ یہاں کوئی کھیلتا ہی نہیں

بکھر گئے تھے جو اعضاء سیٹ لایا ہوں
بس ایک چہرہ ہے جس کو میں ڈھونڈتا ہی نہیں



سب سزاؤں کی جزا پائیں گے
نہند آجائے گی سو جائیں گے

ڈھونڈتے پھرتے ہیں شہروں میں نجات
لوگ جنگل سے بھی ہو آئیں گے

بے سبب سزاؤں پہ پھرتے ہوئے لوگ
اپنے ہونے کی خبر لائیں گے

ہم کو جانا ہے کسی اور طرف
دوست مجبور ہیں گھر جائیں گے

وہ شام

وہ شام ٹھہر گئی آنکھوں میں
جس شام تمہاری آنکھوں نے

سر راہ کہی وہ بات کہ جو
خوشبو کے درتچے کھولتی ہے

وہ شام ٹھہر گئی آنکھوں میں

جس شام کی چپ میں بس یونہی
کچھ تم نے بھی کہنا چاہا تھا
کچھ میں نے بھی کہنا چاہا تھا

وہ شام ٹھہر گئی آنکھوں میں

جس شام کی سرد ہواؤں میں
یرتے کوئل جسم کی خوشبو نے
تادیر مجھے مکائے رکھا



یہ دیکھی دیکھی سے جو لوگ ہیں ترے شہرِ غم کے فقیر ہیں
انہیں چشمِ کم سے نہ دیکھنا یہ بشارتوں کے سفیر ہیں

وہاں ایک طائرِ خوشنوا ہے مجھوں کا پیامبر!
یہاں شغلِ جنگ میں جلا بھی قاتلوں کے امیر ہیں

میں تو تیرگی ہی سا کروں، میں تو روشنی ہی نکلا کروں
میری تیرہ شب کی جبین پر مرے دستِ ملو منیر ہیں

بادباں کھولے ہیں ملاحوں نے
گیت اچھا سا کوئی گائیں گے

وہ پرندے جو اڑے جاتے ہیں
پھول ہیں خوشبوئیں برسائیں گے

چاندنی ڈھونڈنے امجد صاحب
دور جھیلوں کے نگر جائیں گے



شیشہ دل کے مقابل سنگ ہے اپنی جگہ
اہل دنیا سے ہماری جنگ ہے اپنی جگہ

چینی چٹکھارتی سڑکیں نصیبِ شر کا
اک سکوتِ شام کا آہنگ ہے اپنی جگہ

ناصح بے دردت سے ہے منطقِ آزما!
اور ہمارا عاشقانہ ڈھنگ ہے اپنی جگہ

زندگی کرنے کی کوئی دار دیتا ہے مگر
ہجر کی شب صبح کرنا ننگ ہے اپنی جگہ

.....

وہ بگڑ اپنے کمال میں ہیں ہوں تھا اپنے زوال میں
میں بھی آپ اپنی مثال ہوں وہ بھی آپ اپنی نظیر ہیں

یہ ہوا ہے کیا کہ تھے نہیں تری اٹک ہاری کا سلسلہ
کئی دن سے آہہ نوشوا بنے آپ میر فقیر ہیں

.....



ہزار لوگوں میں وہ معتبر نہیں آیا
کہ خود نمائی کا اس کو ہنر نہیں آیا

تجھے تلاش نئی اور حسین جگہوں کی ہے
میں اک جزیرہ ہوں کوئی ادھر نہیں آیا

میں تیرے شہرِ طلسمات سے نہیں نکلا
میں گھر میں بیٹھا ہوں لیکن میں گھر نہیں آیا

کسی سے عشق جو کرتے تو کوئی بات بھی تھی
گلد نہیں جو کوئی بام پر نہیں آیا



آخری حیرت باقی ہے
موت کی دہشت باقی ہے

جسم تو مالا مال ہوئے
روح کی غنیمت باقی ہے

آج بھی میرے ہونٹوں پر
تیری حدت باقی ہے

اور تو سب کچھ ہار چکے
درد کی دولت باقی ہے

جب تک تیری یاد میں ہوں
میری شہرت باقی ہے

دو شعر

کبھی دھوپ میں پکارو کبھی بادلوں میں ڈھونڈو
وہ جو آنکھ سے ہے اوجھل اسے موسموں میں ڈھونڈو

کسی دن نصیب جاگے مرے شرِ بے اماں کا
کوئی فائنٹہ کا پر ہی کہیں جنگلوں میں ڈھونڈو

.....

یہ میری آخری سچائی بھی تار اس پر
وہ ایک خواب جو نیندوں میں در نہیں آیا

یہ شعر کتنا تو امجد و بال جان ہوا
خوشا وہ لوگ جنہیں یہ ہنر نہیں آیا

.....

شاید نقب زلوں سے تحفظ یہ دے سکے
روٹی کا ایک ٹکڑا سگِ در کے واسطے

لہریں ہیں بدحواس تو کرنیں ہیں مضطرب
ٹکڑا ہے چاند جیسے سمندر کے واسطے

لے دے کے ایک جائے اماں ہے یہ ناصحوا!
”میخانہ کیسے چھوڑ دوں دفتر کے واسطے“

○

یہ کیا کہ صبح و شام کریں زر کے واسطے
سوا کچھ اور چاہیے گا سر کے واسطے

جب اختلافِ رزق مرا شہر سے رہا
گھرِ معاش کیسے کوں گھر کے واسطے

ہو عمد کوئی خون سے رہتے ہیں تر ہتر
کچھ سر تو جیسے وقف ہیں پتھر کے واسطے

تیری آواز ہی کافی ہے مجھے
گم شدہ عشق منانے کے لئے
جس کو روٹھے ہوئے صدیاں کزری
چیننے شہر کی تنہائی میں
مدتوں بعد یہ اک ”لظم“ کہی ہے میں نے
یہی اک لظم مرے عشق کا ہے پہلا سراغ
پھول مہکیں گے مری شاخ ہنر پر پھر سے
گھر سے نکلوں گا میں خوشبو کے سفر پر پھر سے

آواز

میں تجھے دور ستاروں میں عبث ڈھونڈتا تھا
یہ کھلا آج کہ آباد ہے ست رنگ زمیں پر تو کہیں
جان!

یہ سچ ہے کہ میں نے نہیں دیکھا تجھ کو
اور ضروری بھی نہیں ہے کہ ترے عارض و لب
روشنی بن کے مری تیرہ شبی سے الجھیں
میں نے اب تک تو بس ”آواز“ سنی ہے تیری



شبِ سیاہ میں یہ روشنی سے کیسی ہے
دیارِ غم زور! تجھ کو خوشی سی کیسی ہے

اتر رہی ہیں یہ آنکھوں پہ لہنڈکیں کیسی
یہ دل میں کھلتی ہوئی شعل سی کیسی ہے

یہ کیسی خوشبوئیں چھنتی ہیں شب کی زلفوں سے
سوارِ روح میں یہ نغمگی سی کیسی ہے

مگر وہ عشق بھی آخر فریب ہی نکلا
یہ تیرے ہوتے ہوئے بھی کمی سی کیسی ہے

ہے مہراں کوئی ہم سے بے حسوں پر بھی
کہ شہرِ مرہ میں یہ زندگی سی کیسی ہے



موسم کڑا تھا ہجر کا لیکن سراب سا رہا
میں بھی رہا ہوں خوش بہت وہ بھی گلاب سا رہا

میں بھی ہوں کتنا سنگدل اس کو کبھی پڑھا نہیں
جو شخص میرے واسطے اکثر کتاب سا رہا

چھو کر اسے جو دیکھا تو مجھ سی گئیں محبتیں
اچھا لگا ہے آنکھ کو جب تک وہ خواب سا رہا

اس مہراں کے شہر میں موسم عجیب تھا مرا
دل میں دہکتی دھوپ تھی سر پر سحاب سا رہا

بہزاد خوش رہا کرو گڑھنے سے فائدہ ہے کیا
اس شہر پر تو عمر بھر کوئی عذاب سا رہا

خواب میں کسی ہوئی انظم
جان اور تما بزرگ
انگہا مجھ سے کہے
بنگلوں میں وہ
شہر سے آتا ہے
وہ تمہیں مل جائے گا
دھونڈنے لگا ہے
ذہب ورت تھے وہ لوگ
عشق جو کرتے رہے



کون سفاک کے عتاب میں تھے
لوگ سارے کسی عذاب میں تھے

قریبوں کا تھا وہ تمنائی
فاصلے میرے انتخاب میں تھے

کیا خبر کس مگر ہوئے آباد
وہ جو اچھے دنوں کے خواب میں تھے

یہ تو ہم کو ہی پہ پیار آیا
ورنہ ہم لوگ کس حساب میں تھے

کتنے سچے تھے قول کے امجد
وہ جو دشمن مری جناب میں تھے

.....

دو شعر

شہر کے سب ہاسیوں کا ایک سا انجام تھا
صورتیں بگڑی ہوئی تھیں آئینہ دشنام تھا

جانے کس کی آہ کا تھا یہ طلسماتی اثر
تیرگی چپختی نہ تھی اور صبح کا ہنگام تھا

آؤ تھوڑی دیر کو
جی لیں پرانے عمد میں

جاننی ہے
لوگ ہیں سوئے ہوئے



کوشش کی بات کی، کوئی وعدہ نہیں کیا
عزمِ وفا کا اب کے اعادہ نہیں کیا

اے کاش عہدِ رفتہ سے آواز دے کوئی
مدت سے ذکرِ ساغر و بادہ نہیں کیا

آخر کو گھر ہی لوٹنا ٹھہرا تو فائدہ
= سوچ کر سفر کا ارادہ نہیں کیا

نانِ جوہیں ملی تو شکم سیر ہو گئے
فکرِ معاش ہم نے زیادہ نہیں کیا

.....



یہ کیا کہ لطفِ شامِ ملاقات وہ نہیں
کوئی نہیں ہے بات تو کیوں بات وہ نہیں

تو بھی کھچا کھچا ہے زباں کے سوال پر
میں بھی مجھا مجھا ہوں کہ حالات وہ نہیں

میری تو ساری انگلیاں برفاب ہو گئیں
یہ جو ہیں میرے ہاتھ میں یہ ہاتھ وہ نہیں

آنکھوں کو کیا کروں کہ وہ منظر نہیں رہا
روحیں ہیں حیرتیں کہ ظلمات وہ نہیں

خوش ہوں کہ میر کی طرح امجد میں خوار ہوں
اچھا ہوا جو عزتِ سادات وہ نہیں

.....

ایک حسرت

کسی جنگل کی تماشا میں
سایا نظر آئے
کوئی اپنی طرح سے شرمیں
تما نظر آئے
مسافر دیکھ کر کوئی ہمیں
رکتا نظر آئے
کوئی صدیوں پرانے عشق کو
روتا نظر آئے
کسی سے عشق ہو جائے

**Get more e-books from www.ketabton.com
Ketabton.com: The Digital Library**